میر انیس کے سلاموں میں نِسائی لب ولہجہ

سیدہ عنبر فاطمہ عابدی

Abstract:

Mir Anis was a great poet and he is considered to be "Master of the Genre of Mersia". Apart from mersia, he also composed innumerable Salams for the martyrs of Karbala and their relatives. As history says, there were men, women and children who accompanied Imam Hussain (A.S) in Karbala. After the tragedy and martyrdom of Imam Hussain (A.S) and some of his distinguished companions, the remaining relatives lamented on the tragic end of their loved ones. When Mir Anis depicts their sentiments and portrays the sad emotional expressions, he uses all the variety of accents and emotional expressions. This quality of Mir Anis is very rare because it is very much nearer into the human nature. It is a fact that even the Prophets, Imams and spiritual leaders also behaved like humans when there was any tragic event in their lives. We have therefore, proved by citing examples from the Salams of Mir Anis to justify the title.

میر انیس اردو شاعری میں اس ستون کی حیثیت رکھتے ہیں جنھوں نے اودھ کے زوال پذیر معاشرے میں اپنی سخن طرازیوں سے مذہبی و اخلاقی اقدار کی لرزتی اور کمزور پڑتی بنیادوں کو ازسرنو توانائی اور استقامت عطا کی۔ انھوں نے اپنا کمال سخن مذہبی اصنافِ شاعری میں اس حد تک نمایاں کیا کہ مرثیہ بطور صنف ، اردو شاعری کے بام عروج تک پہنچا اور اخلاقی لحاظ سے بھی اس کی حیثیت اصلاحِ معاشرہ کے لیے موزوں ترین قرار پائی۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا الطاف حسین حالی نے نہ صرف ذخیرۂ الفاظ کو خوش سلیقگی اور شائستگی سے برتنے کے لحاظ سے میر انیس کی برتری تسلیم کی بلکہ ساتھ ساتھ ان کے مراثی کو بھی بہترین و اعلیٰ اخلاقی نظمیں قرار دیتے ہوئے یہ لکھا ہے:

''اس خاص طرز کے مرثیہ کو اگر اخلاق کے لحاظ سے دیکھا جائے تو بھی ہمارے نزدیک

اردو شاعری میں اخلاقی نظم کہلانے کا مستحق صرف انھیں لوگوں کا کلام ٹھہر سکتا ہے بلکہ جس اعلیٰ درجہ کے اخلاق ان لوگوں نے مرثیہ میں بیان کیے ہیں ان کی نظیر فارسی بلکہ عربی شاعری میں بھی ذرا مشکل سے ملے گی۔''(۱)

یقیناً میر انیس اور ان کے معاصرین میں خاص طور پر مرزا دبیر نے مرثیے کو مجموعی طور پر اخلاقیات سے بھرپور تاثر دینے کی سعی بلیغ کی ہے مزید یہ کہ مذہبی اصناف سخن پر تحقیق و انتقاد کی نئی راہیں کشادہ کرنے کا سہرا بھی انھی کے ہی سر جاتا ہے، تاہم انیس کی فوقیت کو حالی ہی نہیں بلکہ کم و بیش تمام نقادان ادب نے تسلیم کیا ہے۔ جس کی سب سے بڑی دلیل شبلی جیسے نقاد کا یہ اعترافِ حقیقت ہے:

''مدت سے میرا ارادہ تھا کہ کسی ممتاز شاعر کے کلام پر تبصرہ کروں جس سے اندازہ ہوسکے کہ اردو شاعری، باوجود کم مائیگی زبان کیا پایہ رکھتی ہے، اس کے لیے میر انیس سے زیادہ کوئی شخص انتخاب کے لیے موزوں نہیں ہوسکتا تھا کیونکہ ان کے کلام میں شاعری کے جس قدر اصناف پائے جاتے ہیں اور کسی کے کلام میں نہیں پائے جاتے۔''(۲)

انیس کے کلام کے مطالعے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ علامہ شبلی نعمانی نے انیس کے مقام و مرتبے کے تعین میں جو اعتراف کیا ہے وہ اردو شاعری کی ضرورت بھی تھا اور شاعری کے قد میں اضافہ بھی۔ یہ حقیقت ہے کہ میر انیس نے اپنے کلام میں ان تمام افکار اور محاسنِ شعری کو اجاگر کیا ہے جو شاعری کو اثر انگیزی بخشنے کے ساتھ ساتھ ابدیت بھی عطا کرتے ہیں۔ اسی لیے جہاں بھی اردو شاعری سے شغف رکھنے والے اہل فکر و نظر موجود ہیں، وہاں زمان و مکان کے فاصلوں کے باوجود انیس کی ادبی حیثیت تسلیم ہوتی رہی ہے، تاہم عوام الناس کا ''انیس شناسی'' کے متعلق فکری شعور بیدار کرنے کے لیے ضروری تھا کہ انیس کے کلام کے نئے نئے رخ اور نہاں گوشوں کو منظر عام پر لانے کے لیے جستجو کی جائے۔ اس حوالے سے اگر دیکھا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ مراثی انیس پر تحقیق و تنقید کے ضمن میں جس قدر وقیع کام ہوا ہے وہ ایک نوع کی مثالی حیثیت رکھتا ہے۔ علامہ شبلی نعمانی، امداد امام اثر، ڈاکٹر مسعود حسن رضوی ادیب، اثر لکھنوی، ڈاکٹر احسن فاروقی، پروفیسر احتشام حسین، ڈاکٹر شارب ردولوی، ڈاکٹر مسیح الزماں، ڈاکٹر صفدر حسین، علی جواد زیدی، ڈاکٹر اکبر حیدری، نیر مسعود اور ڈاکٹر ہلال نقوی، یہ وہ محققین اور نقادان ادب ہیں جنھوں نے مراثی انیس کی نوعیت اور شعری نکات و محاسن کو اجاگر کرنے میں نیز مرثیوں کے ان گوشوں کو عوام الناس کے سامنے نمایاں کرنے کی وہ گراں قدر کاوشیں کی ہیں جن سے انیس کے فن کے ساتھ ساتھ ان کے فکری زاویوں کو سمجھنے میں بھی رہنمائی ملتی ہے۔ اس ضمن میں نہ صرف انیس کے کلام میں سے مرثیوں کا انتخاب کیا گیا بلکہ سلاموں، رباعیات اور قطعات کو بھی اہمیت دی گئی، تاہم چونکہ انیس کی شاعری میں بنیادی حیثیت مراثی ہی کو حاصل ہے لہٰذا تحقیق و تنقید کا بیشتر کام بھی مرثیوں کے باب ہی میں کیا گیا، مگر یہ امر بھی مسلم ہے کہ دیگر اصناف میں بھی انیس کے ادبی و فنی مرتبے کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ مثال کے طور پر اگر انیس کی سلام نگاری کا مطالعہ کیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ انیس نے اپنی فکر اور فن کے چراغوں سے صنف سلام کو بھی منور و تاباں کیا ہے اور تخلیقی صلاحیتوں کے انمٹ

نقوش ثبت کیے ہیں۔

انیس کی سلام نگاری کے موضوع پر لکھنے سے قبل ضروری ہے کہ یہاں اردو میں سلام نگاری کی روایت اور مختلف ناقدین کی آرا کی روشنی میں سلام کی تعریف وتوضیح کے بارے میں مختصر طور پر بیان کردیا جائے۔ یوں تو تقریباً تمام ہی مذہبی اصناف سخن یعنی حمد ونعت، منقبت و مرثیہ عربی اور پھر فارسی کے ذریعے اردو ادب میں متعارف ہوئی ہیں، تاہم سلام وہ صنف ہے جو صرف اردو میں پھلی پھولی، فارسی شعرا کے یہاں مشکل ہی سے سلاموں کا سراغ ملتا ہے مگر ہندوستان میں بھگتی تحریک اور ایک عام عقیدت مندانہ فضا کے زیر اثر یہاں کے فارسی گویوں نے سلام نگاری کی روایت کا باقاعدہ آغاز کیا۔ بعد میں اردو زبان میں بھی سلام نگاری کے تسلسل سے سلاموں کا ایک ضخیم ذخیرہ جمع ہوگیا(۳)۔ یہاں ذہن میں یہ نکتہ بھی ابھرتا ہے کہ آخر وہ کون سی خوبیاں ہیں جن کی بدولت صنف سلام دیگر اصناف سے مختلف ہے یا وہ کون سی خصوصیات اور مماثلتیں ہیں جو سلام اور دیگر اصناف میں مشترک ہیں۔ اس ضمن میں امداد امام اثر نے یہ لکھا ہے:

> ''عروضی ترکیب کی رو سے غزل، سہرا اور سلام شےِ واحد ہیں مگر ان کے مضامین اور تقاضے ایک دوسرے سے علیحدہ انداز رکھتے ہیں۔۔۔۔ سلام میں غزل کی طرح اعلیٰ درجے کے مضامین از قسم واردات قلبیہ و معاملات ذہنیہ باندھتے ہیں۔ مگر ان میں غزلیت کا رنگ پیدا ہونے نہیں دیتے۔ سلام کی ترکیب کو رنگینی کے ساتھ ساتھ بھی غزل سے علیحدہ ہونا چاہیے۔ سلام گوئی کا لطف یہی ہے کہ شوخی، رنگینی اور طبیعت داری کے ساتھ بھی غزل سرائی سے جدا نظر آتا ہے۔''(۴)

یہ حقیقت ہے کہ سلام کی ہیئت اور تکنیک وہی ہے جو غزل کی ہے بالفاظِ دیگر سلام مرثیے کے غزلیہ اسلوب کا نام ہے۔ سلام میں غزل کی طرح پہلا مطلع ہوتا ہے۔ قافیہ اور ردیف کا التزام کیا جاتا ہے اور مقطع کا اہتمام بھی۔ غزل کی ساری تعریف ذرا سے فرق کے ساتھ سلام پر صادق آتی ہے جس طرح غزل کا ہر شعر اپنے اندر الگ معنی و مفہوم رکھتا ہے اور اشعار میں تسلسل بھی ضروری نہیں اسی طرح سلام میں بھی تسلسل شعر کا التزام ضروری تصور نہیں ہوتا۔ غزل کی طرح سلام میں بھی ایجاز سے کام لیا جاتا ہے(۵)۔ سلام کی انھی خصوصیات اور موضوعات کے حوالے سے شمیم احمد نے یہ لکھا ہے:

> ''یہ ایک مخصوص قسم کی نظم ہوتی ہے، جو عموماً غزل کی ہیئت میں لکھی جاتی ہے اور جس میں مرثیے کی مانند کربلا کے واقعات کا ذکر اور شہدائے کربلا کے فضائل حسنہ کے بیانات نظم کیے جاتے ہیں۔ اسی کے ساتھ مختلف اخلاقی مضامین بھی لائے جاتے ہیں۔''(۶)

درج ذیل اقتباسات کی روشنی میں سلام کا ایک مکمل خاکہ ذہن میں تشکیل پاجاتا ہے تاہم یہ سوال بھی اہم نوعیت کا حامل ہے کہ وہ کون سے اسباب تھے جن کی وجہ سے واقعات کربلا کے موضوعات کے لیے مرثیوں کے علاوہ سلام نگاری کو بھی فروغ ملا۔ اس ضمن میں ایک عام تاثر یہ پایا جاتا ہے کہ چونکہ مرثیے بالعموم خاصے طویل

ہوتے تھے اس لیے وقت اور حالات کی مناسبت سے جذبات کے ارتکاز کے لیے سلام سے کام لیا جاتا۔ کربلا سے متعلقہ جذبات کے بیان میں غزل کے رمز و کنایے کی مدد سے آفاقیت کا تاثر پیدا ہوجاتا اور کربلا کا رشتہ اس دور کی تاریخ سے جڑ جاتا۔(۷) اگر تاریخی اعتبار سے اردو سلام نگاری کا جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ جنوبی ہند میں مرثیوں کے جو قدیم ترین محفوظات دستیاب ہوئے ہیں، ان کی عروضی ہیئت سلام ہی کی ہے۔ چونکہ دور متقدمین تک نہ تو مرثیہ کسی ہیئت کا پابند تھا اور نہ ہی سلام کی کوئی مخصوص ہیئت مقرر ہوئی تھی، لہٰذا دکنی دور میں ایسے مرثیے رواج پا گئے جنھیں ''سلام نما مرثیے'' کہا جاسکتا ہے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر شارب ردولوی نے یہ لکھا ہے:

> ''جس وقت اردو میں مرثیہ گوئی کا رواج ہوا اس کی کوئی ہیئت متعین نہیں تھی۔ لوگ جس طرح چاہتے تھے برائے ثواب یا رونے رلانے کے لیے چند شعر کہہ لیتے تھے یہ شعر عموماً غزل کی ہیئت میں ہوتے تھے اور ان کے ہر شعر کی حیثیت ایک اکائی کی ہوتی تھی ۔۔۔۔۔ جو شکل ابتدائی مرثیوں کی صورت میں غزل کی ہیئت میں ظاہر ہوتی تھی اس نے سلام کی شکل اختیار کر لی اس طرح سلام کی تاریخ کی کڑیاں مرثیے کی ابتدا سے ملی ہوئی ہیں۔''(۸)

سلام و مرثیے کی تاریخ کے باہمی ارتباط کا ثبوت عادل شاہی اور قطب شاہی ادوار کے وہ سلام نما مرثیے ہیں جو اس زمانے کے تمام شعرا کے ہاں ملتے ہیں۔ شمالی ہند میں بھی ہیئت کی کسی خاص پابندی کے بغیر سلام رواج پانے لگے، تاہم اردو سلام نگاری میں سودا اور میر کا زمانہ زبان و بیان کی درستگی، ادبی محاسن اور سلام کے لیے ہیئت کے انتخاب کے حوالے سے انتہائی اہم ہے اور یہی سلام نگاری کا پہلا دور (دور تشکیل) کہلاتا ہے۔ پھر دوسرا دور یعنی (دور تعمیر) ہے جس میں خلیق و ضمیر اور فصیح و دلگیر نے سلام کی ترویج و ترقی میں کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ سلام نگاری کا تیسرا دور (دور عروج) ہے۔ اس میں میر انیس و مرزا دبیر اور ان کے معاصرین و تلامذہ شامل ہیں، تاہم اس دور کے نمایاں ترین شاعر میر انیس ہیں (۹)۔ انیس کے سلاموں کا مطالعہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ انھوں نے مراثی کی طرح سلاموں میں بھی وہ تمام محاسن شعری عیاں کیے ہیں جن کی وجہ سے امداد امام اثر نے یہ تحریر کیا ہے:

> ''خوبیِ زبان، چستیِ بندش، بلند پروازِ مضامین، رنگینیِ طبیعت محتاج بیان نہیں۔ ظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میر انیس صاحب مرحوم جس عمدگی کے ساتھ مرثیہ نگاری فرماتے تھے اسی طرح سلام کے لکھنے پر ایک حیرت انگیز قدرت رکھتے تھے۔''(۱۰)

یہاں اس امر کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ شروع میں سلام سوز خوانی کے طرز پر پڑھے جاتے تھے اور ان میں رثائیت کا عنصر بھی غالب تھا۔ تاہم میر ضمیر کے زمانے میں تحت اللفظ سلاموں کا رواج عام ہوا۔ ان سلاموں میں رثائی عنصر کے مقابلے میں اخلاقیات کا پہلو غالب تھا۔ علی جواد زیدی کے مطابق میر انیس نے تحت اللفظ سلاموں کو بام عروج تک پہنچا دیا۔ عام طور پر تحت اللفظ سلام منقبتی اور اخلاقی ہوتے تھے اور سوز خوانی کے سلام رثائی، انیس نے اپنے سلاموں میں اعتقاد سے پس منظر کا کام لیتے ہوئے آفاقی اقدار اخذ کرنے کی بھر پور سعی

کی[۱۱]۔ انیس کے سلاموں میں حمد و نعت، منقبت اور رثائیت غرض تمام موضوعات موجود ہیں اخلاقی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو بھی یہ سلام ان تمام اخلاقی اقدار کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہیں جو انفرادی و اجتماعی سطح پر ہر فرد معاشرہ کی ضرورت ہوتی ہیں۔ صبر و قناعت ، عزم و استقامت ، بلند حوصلہ و عالی ہمتی، طہارت باطن ، سخاوت و شجاعت ، عاجزی و انکساری، صراطِ مستقیم پر ثابت قدمی، تصنع و ر یا کاری سے بیزاری، محنت کی عظمت، امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی تبلیغ ،حیات بعد الموت اور روز حشر سزا و جزا کے تمام تصورات انیس کے سلاموں میں اخلاقی مضامین کی وسعت و گہرائی کی عکاسی کرتے ہیں اور بلا امتیاز مذہب و ملت دنیا کے تمام انسانوں کو زندگی کی اعلیٰ اقدار و تہذیبی شعور کی رہنمائی فراہم کرتے ہیں۔

اگر طرز خواندگی کے اعتبار سے دیکھا جائے تو میر انیس کے ہاں تحت اللفظ اور سوز خوانی دونوں طرح کے سلام موجود ہیں اور رثائی عنصر بھی دونوں قسم کے سلاموں میں موجود، تاہم انیس کے ہاں یہ رثانیت ایک بینیہ فضا کو تخلیق کرنے میں معاون ثابت ہوتی ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ بین انھوں نے تمام تر واقعاتِ کربلا کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہی تخلیق کیے ہیں ۔یقیناً انیس کربلا میں موجود نہ تھے مگر اپنی چشم تصور سے وہ کربلا کے ایک ایک سانحے کے نہ صرف چشم دید گواہ بن جاتے ہیں بلکہ کربلا میں اہل بیت وشہدا کے تمام کرداروں کے احساسات و جذبات کے ترجمان اور عکاس بھی ۔گویا انیس کے سلاموں میں لفظوں کی تاثیر سے وہ لہجے بھی تشکیل پاتے ہیں جو کربلا میں اشک بار بھی ہوئے اور غم خوار بھی ۔ خاص طور پر ان کی سلام نگاری کا ایک نمایاں ترین رخ وہ ''نِسائی لہجہ'' ہے جو کہیں ایک جوان بیٹے کی لاش پر بوڑھی ماں کی حسرت ہے تو کہیں بھائی کے بے کفن لاشے پر بے ردا بہن کا نوحہ، یہ لہجہ کبھی کمسن بچی کے جذبات کا آئینہ دار بن کر یتیمی و بے کسی کا بین لیے ہوتا ہے تو کہیں باپ کی منتظر میلوں دور مریضہ بیٹی کا شکوہ کناں انداز اور کہیں چھ مہینے کے ننھے سے بچے کے جلے ہوئے جھولے کی لکڑیوں کو گود میں لیے ایک ماں کے مستقل بہتے آنسوؤں اور بے قراری کا مظہر بن جاتا ہے۔غرض انیس نے اختصار و جامعیت کے ساتھ سلاموں میں انسانی جذبات بالخصوص صنف نازک کے احساسات کی جو بھر پور عکاسی کی ہے اس کی نظیر ملنی ناممکن ہے ۔ پھر یہ خواتین کوئی عام عورتیں بھی نہیں بلکہ خاندان رسالتؐ سے نسبی تعلق کی بنا پر ممتاز و مشرف بھی ہیں۔مگر ان سب فضیلتوں اور اوصاف کے علاوہ جو قدر ان میں مشترک ہے وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے عورت کو مرد کے مقابلے میں اتنی استقامت و برداشت نہیں دی کہ وہ مصائب و آلام کا ہر مرحلے پر مقابلہ کر سکے۔ چنانچہ انیس کے سلاموں میں بھی مخدرات عصمت کے جذبات کی وہی کیفیت نمایاں ہے جو تمام رشتوں سے جڑی ایک عورت کی بھائی ، بیٹے اور دیگر رشتوں کی جدائی میں ظاہر ہوتی ہے۔ یقیناً جذبات کی بھر پور عکاسی ہی نے کلام انیس کو پر تاثیر اور وقیع بنانے میں کلیدی کردار ادا کیا ہے۔ انیس نے مرثیوں کی طرح سلاموں میں بھی جذبات کی مختلف کیفیتوں کو رقم کیا اور یہ کیفیتیں جب وہ مخدرات عصمت کے رویوں اور لہجوں کے ذریعے واضح کرتے ہیں تو واقعۂ کربلا اور اس سے وابستہ ہر خاتون کا کردار اور دلی حالت بھی عیاں کر دیتے ہیں۔ یوں تو انیس نے نسائی لہجوں میں جوش وولولے، غیض و غضب، خوشی ومسرت ، حیرت واستعجاب ،غرض تمام ہی جذبات کو عیاں کیا ہے مگر ان میں سب سے نمایاں جذبہ درد

وغم کا ہے اور یہ وہی جذبہ ہے جسے علامہ شبلی نعمانی تمام جذبوں پر فوقیت دیتے ہوئے کہتے ہیں:

''جذبات میں درد وغم کا جذبہ، اور جذبات سے قوی تر ہے، اور جس جوش سے یہ ظاہر ہوتا ہے اور جذبات ظاہر نہیں ہوسکتے۔'' (۱۲)

بلا شبہ جذبات کے اظہار میں سب سے اہم ذریعہ انسان کا وہ لہجہ ہے جو انداز میں کہیں مد و جزر کے ذریعے احساسات کی ترجمانی کرتا ہے اور لہجوں کے انھی بدلاؤ سے ہی انسان کے محسوسات اور جذبوں کا صحیح ادراک کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ انیس نے سلام نگاری میں انھی لہجوں کے اتار چڑھاؤ سے متنوع جذبات کی عکاسی کی ہے۔مگر کمال یہ ہے کہ اس عکاسی میں وہ تاریخی حقائق کو بھی ملحوظ رکھتے ہیں۔مثال کے طور پر انیس جب حضرت زینبؑ بنت علیؑ کے احساسات و جذبات کو لفظی جاموں کے لہجے عطا کرتے ہیں تو ان کا کردار کربلا میں امام حسینؑ وحضرت عباس کی بہن،عون ومحمد کی والدہ، امام سجادؑ ،حضرت علی اکبر و جناب سکینہ کی پھپھی کے طور پر نمایاں ہوتا ہے۔ زینبؑ کبھی اپنے بھائی کا حوصلہ بڑھاتی ہیں تو کبھی اہل حرم کی ڈھارس بندھاتی ہیں مگر اس کے ساتھ ساتھ وہ ایک ایسی ماں بھی ہیں جس نے اپنے دونوں بیٹوں عون ومحمد کو اپنے بھائی پر سے صدقہ کر دیا ہے اور اب بیٹوں کو یہ احساس بھی دلا رہی ہیں کہ تم دونوں کو اپنے ماموں پر قربان ہونے میں سبقت دکھانی ہے اور یہ بھی یاد رکھو کہ تم اپنے نسبی تعلق کی بنا پر اوروں سے ممتاز ہو تو جنگ میں شجاعت و دلیری کے جوہر بھی وہی ہونے چاہیں جو تمہارے نانا علی مرتضٰی اور دادا جعفر طیار کی جنگوں میں نظر آتے تھے۔ زینب کا جوشیلا لہجہ اس موقعے پر بیٹوں کا حوصلہ بھی بڑھا رہا ہے اور ان کے جذبہ و جوش بہادری کو گرما بھی رہا ہے۔

میر انیس نے حضرت زینب کے اسی لہجے کی یوں عکاسی کی ہے:

زینب یہ بولیں بیٹوں سے باہم چلے تو ہو
لڑیو سپاہ شام سے جا کر جدا جدا
جرات میں ایک سے ہو ، یہ جی چاہتا ہے آج
دکھلاؤ شانِ حیدر و جعفر جدا جدا (۱۳)

حضرت زینبؑ کے صبر وضبط کی طاقت کو ان کے اٹل لہجے سے باآسانی محسوس کیا جاسکتا ہے۔ دونوں بچے میدان جنگ میں بہادرانہ لڑتے ہوئے جامِ شہادت نوش کرتے ہیں اور جب ان کی لاشیں ماں کے سامنے آتی ہیں تو زینب ان کی شہادت پر خدا کے سامنے اور نانا رسول اللہ و اپنی ماں فاطمہؑ زہرا کے سامنے سرخروئی محسوس کرتی ہیں کہ ان کے بیٹے حسینؑ کو بچاتے ہوئے دین حق پر قربان ہوگئے۔ اس موقعے پر انیس نے حضرت زینبؑ کے لہجے میں ایک نوع کی سرخوشی ،طمانیت کی کیفیت دکھائی ہے جو بیٹوں کی لاشیں دیکھ کر یوں عیاں ہوتی ہے:

جب آئیں بیٹوں کی لاشیں تو کہتی تھیں زینب
کچھ ان کے مرنے کا مطلق نہیں ملال مجھے

فدا کروں گہر بے بہایہ ، زہراؑ پر
دیے تھے حق نے اسی واسطے یہ لال مجھے
وغا میں تیغوں کے پھل کھائے پھول سے تن پر
نہال کر گئے یہ دونوں نونہال مجھے (۱۴)

مگر یہاں اس حقیقت کو بھی مدِ نظر رکھنا چاہیے کہ دنیا کی کوئی بھی ماں بیٹے کی جدائی پر شکر خدا تو ادا کرسکتی ہے مگر دلِ آزردہ کی کیفیت کو نہاں نہیں کرسکتی۔ یہ نکتہ بھی اہم ہے کہ بعض نقادوں نے انیس کے کلام پر یہ اعتراض کیا ہے کہ وہ مراثی وسلام میں بینیہ و بکائیہ فضا کی تخلیق میں صبر وضبط اور استقامت و بردباری کی اعلیٰ مثال ہستیوں کو محض روتے دھوتے اور ماتم ونوحے میں مشغول ہی دکھلاتے ہیں اور یہ آنسو بہانا ان ہستیوں کی شان کے زیبا نہیں۔ اس ضمن میں پروفیسر مجتبیٰ حسین نے اس بینیہ عنصر کی توجیح یوں پیش کی ہے:

''نظریوں کو سب کچھ سمجھ لینا اور آدمی کی فطرت کو نظر انداز کردینا کوئی قابلِ تحسین بات نہیں ہے انیس کے کردار صبر وضبط کا پیکر ہیں۔ مگر وہ دل کے کٹھور اور بے روح نہیں ہیں ان میں بھر پور آدمیت پائی جاتی ہے۔ ان میں انانیت ہے ان کا عمل موقع ومحل کی مناسبت سے غیر فطری نہیں ہوتا ہے۔ ماں باپ جوان بیٹے کو میدانِ جنگ میں پورے صبر وضبط کے ساتھ بھیج دیتے ہیں مگر جب اس کی لاش آتی ہے تو آنکھیں چھلک پڑتی ہیں یہ وہی کرتے ہیں جو دنیا کا ہر باپ اور ماں اس موقع پر کرتی یا اسے کرنا چاہیے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو وہ سب کچھ ہوسکتے ہیں مگر ماں باپ نہیں ہوسکتے۔'' (۱۵)

پھر یہاں یہ پہلو بھی اہم ہے کہ انیس نے واقعہ کربلا میں جن کرداروں کو حق اور باطل کا نمائندہ قرار دیا ہے ان میں باطل اور شر پر ڈٹی ہوئی فوج شقی القلب لوگوں پر مشتمل ہے جن میں خدا ترسی ، ہمدردی اور رحم کے جذبات مفقود ہیں ، جبکہ حق کے نمائندہ حسینؑ ابن علی اور ان کا قافلہ حق کے پرچم کی پاسداری کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے طرزِ عمل سے ظلم کے خلاف بغاوت کا مظاہرہ تو کر رہے ہیں مگر اس میں بھی وہ رحم اور انسانی فطرت کے تقاضوں کو فراموش نہیں کرتے۔ اس کی ایک واضح مثال اس موقعے کی ہے جب عون ومحمد کی لاشوں پر ماں آتی ہے۔ انیس نے اس موقعے کی مناسبت سے مامتا کے جذبات کی بھر پور عکاسی کرتے ہوئے ماں کے لہجے کو درد وغم سے لبریز اور بکائیہ تاثر دیا ہے:

زینب نے کہا لاشوں سے بیٹوں کی لپٹ کر
کس طرح یہ ماں آہ و بکا کر کے نہ روئے
جس طرح سے میں لاشوں میں روتی ہوں وہ اس طرح
صدقے گئی ، تابوت پہ مادر کے نہ روئے (۱۶)

انیس نے یہاں ایک ماں کے لہجے کی اس حسرت کا اظہار بھی دردانگیزی سے کیا ہے کہ ہر ماں کی خواہش ہوتی ہے جوان اولاد نہ صرف زندگی میں سہارا بنے بلکہ قبر کی آخری منزل تک بھی ماں باپ کی میتوں کو کاندھا دے،

مگر کربلا کی ماؤں کی یہ خواہش بھی تشنہ رہی جس کا درد ان کے لہجوں میں در آیا ہے۔ چنانچہ کربلا کی ایک اور ماں جس کا اٹھارہ سال کا کڑیل جوان بیٹا علی اکبر فوجِ اشقیا کے ہاتھوں قتل ہو چکا، وہ ماں بھی بین کرتی ہوئی اپنی حسرتوں کو یوں بیان کرتی ہے:

کہتی تھی رو رو کے بانو یہ توقع تھی مجھے
کہ اٹھائے گا جنازہ، علی اکبر میرا
میں تو جیتی رہی اور اٹھ گئے وہ دنیا سے
ان کی تقصیر نہیں کچھ ہے مقدر میرا (۱۷)

اس ماں کا بیٹا چونکہ نوجوانی کی دہلیز عبور کر چکا ہے تو اس کی شادی کا ارمان بھی ماں کے دل میں ہلکورے لے رہا ہے۔ یہاں ماں کے دل کی کیفیت کا وہ رخ انیس عیاں کرتے ہیں جو عرب سے تعلق رکھتی ہو یا عجم سے، چاہے اس کا کسی بھی سماجی وتہذیبی نظام سے رشتہ ہو مگر بیٹے کے جوان ہوتے ہی ماں کی آنکھوں میں اس کے سہرے کے خواب اور شادی کی تمنا جاگ اٹھتی ہے۔ چنانچہ انیس نے یہاں ایک ماں کے ان جذبات کو بھی پر درد لہجہ عطا کر دیا ہے جو جانتی ہے کہ جوان بیٹا راہِ خدا میں قربان ہو جائے گا۔ اس لیے اسے اذنِ جہاد دینے میں تردد میں مبتلا ہو کر نہ صرف جنگ میں جانے سے روکتی ہے بلکہ اس روکنے کی وجہ بھی بیان کر دیتی ہے:

ماں کہتی تھی اکبر سے کہ مرنے کو نہ جاؤ
بیٹا ابھی میں نے ترا سہرا نہیں دیکھا (۱۸)

اس بے قرار ماں کا لہجہ اس وقت اور بھی دردناک ہو جاتا ہے جب علی اکبر کی لاش پر وہ اپنی تمام حسرتوں کا نوحہ کرتے ہوئے کہتی ہے:

لاش اکبر پہ چلاتی تھی بانوئے حزیں
تم کو دولھا نہ بنے اے مرے دلبر دیکھا (۱۹)

کوئی حسرت مرے دل کی نہ نکلنے پائی
تم کو دولھا بھی نہ اے لال بنایا میں نے (۲۰)

بانو کہتی تھی کہ سہرا بھی نہ دیکھا افسوس!
تھی مجھے بیاہ کی اکبر کے تمنا کیا کیا (۲۱)

ماں کے لہجے کا یہ غم انگیز تاثر اس کے دلی جذبات کا آئینہ بھی ہے اور حسرتوں کا اظہار بھی۔ یقیناً جوان بیٹے کی میت پر ایک ماں اسی طور بین کیا کرتی ہے اور یہ قانونِ فطرت کے مطابق بھی ہے۔ بلاشبہ کربلا کی ماؤں کے پایۂ استقامت میں کہیں لرزش نہیں ہوتی مگر وہ ایک ماں کا دل بھی رکھتی ہیں جو اولاد کی ذرا سی تکلیف پر تڑپ اٹھتا ہے۔

اولاد چاہے جوان بھی ہو جائے پاس نہ ہو تب بھی ماں کے دل کی کیفیت میں زمان و مکان کے فاصلے حائل نہیں ہوتے، تاہم کربلا میں ایک ایسی ماں بھی موجود ہے جس کا چھ ماہ کا بیٹا علی اصغر بھی پانی کی بندش، بھوک پیاس کی بنا پر یہ اپنی حیات ہی میں زندگی کی تابانیاں کھوتا جا رہا ہے۔ یہ بچہ ابھی زندہ تو ہے مگر بھوک پیاس کی شدت اور گرمی کی حدت سے بے حال و نیم جاں ہے۔ ایسے موقع پر اس شش ماہے کی ماں بھی بچے کو دیکھ دیکھ کر تڑپ رہی ہے وہ بچے کے والد امام حسینؑ سے بچے کی کیفیت کو یوں بے قرارانہ و بے تابانہ لہجے میں بیان کرتی ہے:

کہا بانو نے شہ سے تیر چلتے ہیں کلیجے پر
مرا منہ جب یہ بچہ نرگسی آنکھوں سے تکتا ہے
یہ ننھے ننھے دونوں ہاتھ بل کھاتے ہیں تکیوں پر
مسوڑھے ہوگئے ہیں نیلگوں، تالو لہکتا ہے
بچا لو واسطہ زہرا کا صاحب! میرے اصغر کو
نہ بچہ دودھ پیتا ہے، نہ اب آنکھیں جھپکتا ہے
صراحی دار یہ گردن ڈھلی جاتی ہے بن پانی
گلے میں سانس جب رکتی ہے سر دے دے پٹکتا ہے (۲۲)

بچے کی اس دگرگوں ہوتی حالت پر ایک ماں کا اضطراب و بے چینی قدرتی امر ہے مگر یہاں انیس نے بچے کی کیفیت کو جس جزئیات کے ساتھ ماں کی زبانی بیان کیا ہے اس سے ماں کا بھرپور مشاہدہ بھی سامنے آتا ہے، پھر یہ بھی کہ یہ بیبیاں خاندانِ نبوت سے تعلق رکھتے ہوئے امام حسینؑ کے مقام و مرتبے کی آگہی رکھتی ہیں چنانچہ زوجۂ حسین جب اپنے بچے کی حالت بیان کر رہی ہیں تو اس میں شوہر کے لیے شکوہ و خفگی نہیں بلکہ حفظِ مراتب کا لحاظ اور عجز و انکساری بھی نمایاں ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ رشتوں کی حرمت کا احساس اور تہذیبی آداب کا اظہار جس طرح انیس نے مراثی میں کیا ہے بعینہٖ سلاموں میں بھی اس کا پرتو نظر آتا ہے۔ خاندان کی باہمی محبت اور پرخلوص تعلقات کے ساتھ ساتھ ہر رشتے کا اندازِ تخاطب عمر اور مرتبے کو ملحوظ رکھتا ہے۔ یقیناً ان میں صدیوں کا تہذیبی رچاؤ، اسلامی تعلیم کا نچوڑ، انسانیت کا درد و محبت اور ایثار کی نادر مثالیں نظر آتی ہیں[۲۳]۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ علی اصغر کی ماں بھی اضطراب کی حالت میں امام حسینؑ کے احترام و مرتبے کا پاس و لحاظ رکھتی ہوئے اپنی دلی کیفیت بیان کرتی ہیں۔ مگر ظاہر ہے کہ بچے کی تشنہ دہانی بڑھنے کے ساتھ ساتھ ماں کی بے قراری میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا ہے اور اب وہ ایک ایک درِ خیمہ پر جا کر بچے کی سیرابی کی فریاد کرتی ہے۔

بہو زہرا کی کہتی تھی یہی جا جا کے ڈیوڑھی پر
ارے پانی کوئی لادو، مرا بچہ بلکتا ہے (۲۴)

انیس نے یہاں ماں کے بے قرار لہجے میں مزید اضطرابی و اضطراری رنگ کی عکاسی کے لیے لفظ ''ارے'' کا بھی اضافہ کر دیا ہے۔ یقیناً ارے اسی وقت کلام کا حصہ بنتا ہے جب جلدی اور بے قراری کے

اشارے مقصود ہوں۔ مگر بچے کی پیاس پانی کے بجائے تیرِ ستم گار سے ہمیشہ کے لیے بجھ جاتی ہے اور اس کی قبر کربلا کے تپتے صحرا میں ماں کے آنسوؤں سے تر ہوتی جارہی ہے۔ ماں کے دل کو صرف ننھے بچے کی جدائی کا غم ہی نہیں کھائے جارہا بلکہ وہ اس ویران جنگل میں بچے کی قبر میں پہلی رات اور اس عالم تنہائی سے بھی مختلف اندیشوں کا شکار ہے۔ اسی لیے وہ اپنے بچے کی قبر سے جدا نہیں ہونا چاہتی۔ وہ اک ماں ہے جو چھوٹے بچے کی نفسیات سے نہ صرف واقف ہے بلکہ بچے کی نیند کی کیفیت کو بھی بخوبی سمجھتی ہے لہٰذا جب اسے قبر علی اصغر سے جدا کیا جاتا ہے تو وہ پریشان کن لہجے میں گویا ہوتی ہے:

جُدا جو کرتے تھے اعدا، مزار اصغر سے
تو بانو کہتی تھی، اتنا نہ دو ملال مجھے
خدا کے واسطے مقتل میں مجھ کو رہنے دو
کہ شب کو چونک کے ڈھونڈھے گا میرا لال مجھے (۲۵)

علی اصغر کی ماں جانتی ہے کہ چھوٹے بچے نیند میں کبھی چونکتے بھی ہیں اور کبھی ڈر بھی جاتے ہیں۔ ایسے میں ماں کی آغوش اور اس کا لمس ہی انہیں جائے تحفظ و پناہ گاہ محسوس ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ ماں بھی بچے کی اسی حالت کے پیش نظر اس کی قبر سے جانا نہیں چاہتی۔ اپنے بیٹے کی حالت کو جانتے ہوئے وہ لوگوں سے مخاطب ہے اور قبر علی اصغر پر رہنے کا جواز یوں دے رہی ہے:

بانو کہتی تھی کہ جنگل میں ڈرے گا، لوگو!
کبھی تنہا نہیں سویا علی اصغر میرا (۲۶)

پھر اس ماں کی گود چونکہ ابھی ابھی خالی ہوئی ہے تو بچے کی چند نشانیاں اس کی یادگار بن کے ماں کے دل میں چھپی پر درد حسرتوں کی غمازی کا سامان بھی کررہی ہیں۔ اصغر کا خالی جھولا اور اس کا کرتا ماں کے لہجے کا کرب یوں عیاں کرتا ہے:

کہتی تھی ماں، سوئے اصغر قبر میں
ہائے خالی ان کا جھولا رہ گیا
کس کو اب پہنائے مادر دل جلی
چل بسے وہ ، یہ شلوکا رہ گیا (۲۷)

میر انیس نے سلاموں میں جہاں عورتوں کے مختلف رشتوں سے وابستہ جذبات کی ترجمانی کی ہے وہیں ان رشتوں سے جڑا ہر انداز محبت بھی منفرد اور جدا دکھایا ہے اور ان سب کے لیے کبھی وہ ماں کے لہجے میں تڑپ اور للک کو دکھاتے ہیں تو کبھی بہن کے لہجے میں زینب بنت علی کی اپنے بھائی حسین کے لیے والہانہ محبت کی تصویریں پیش کرتے ہیں۔ یقیناً انیس نے ان سب رشتوں سے منسلک احساسات و جذبات کو ان لفظی کیفیتوں کے ذریعے سے عیاں کردیا ہے کہ ان کے لہجے سماعتوں میں گونجتے محسوس ہوتے ہیں۔ انیس نے واقعہ کربلا سے متعلق کسی بھی انسانی

رشتے کو فراموش نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ایک بہن کی اپنے بھائی سے دم آخر جدائی کی کرب ناک ساعتیں بھی ان کے ہاں تمام تر احساسات کی ترجمان کے طور پر موجود ہیں۔ زینبؑ اپنے بھائی حسینؑ سے روزِ عاشور بچھڑ رہی ہے، حسینؑ آخری رخصت کے لیے خیمے میں آتے ہیں تو زینبؑ کے رنج و اضطراب کا عالم ہی اور ہے:

بہن کا حال عجب تھا دم وداع حسینؑ
پکارتی تھی کہ چھوڑے نہ جاؤ زینب کو
صدائے فاطمہؑ آئی کہ اے مرے شبیر
تڑپ رہی ہے گلے سے لگاؤ زینب کو (۲۸)

اب یہاں بہن اور بھائی کے علاوہ ایک ماں کی اپنی دونوں اولادوں کے لیے ممتا کے جذبے کا اظہار بھی سامنے آتا ہے۔ بھائی اپنی بہن کو ہمیشہ کے لیے بچھڑنے سے پہلے الوداعی سلام کر رہا ہے اور بہن اس کے فراق کے تصور ہی سے بے چین ہے اگرچہ اس موقع پر ماں کا وجود نظروں سے نہاں ہے مگر اس کی آواز کو بیٹا اور بیٹی دونوں سن بھی رہے ہیں اور محسوس بھی کر رہے ہیں۔ یہ ماں فاطمہؑ زہرا ہے جو ایک طرف اپنے بیٹے حسین کی ذبحِ عظیم کے لیے بیٹی زینب کا حوصلہ بڑھا رہی ہے تو دوسری طرف حسین سے زینب کو تسلی دینے کا بھی کہہ رہی ہے۔ یقیناً ہر بہن کے لیے بھائی ڈھارس اور آس ہوا کرتے ہیں اور جب یہ آس ٹوٹنے والی ہو تو بہن کا کرب اس کے لہجے میں سما جاتا ہے:

ذبح شہ ہوتے تھے چلاتی تھی زینب رو رو
بے گنہ قتل شہ ہر دوسرا ہوتا ہے (۲۹)

حسین قتل ہو چکے اور پھر وہ وقت بھی آیا کہ زینب لاشہ حسین کے پاس آتی ہے۔ انیس نے اس مرحلے پر ایک بہن کے بھائی کی لاش دیکھ کر جو احساسات ہو سکتے ہیں ان سب کا امتزاج زینب کے لہجے میں نمایاں کر دیا ہے:

لپٹ کے لاشۂ حسین سے یہ بولی بنت علی
خدا کے واسطے بھیا بلاؤ زینب کو
بہن کے جینے کا دنیا میں اب مزا نہ رہا
پدر سے، نانا سے، ماں سے ملاؤ زینب کو
گلا کٹانے دیا کیوں نہ اپنے بدلے مجھے
میں تم سے روٹھ گئی ہوں، مناؤ زینب کو (۳۰)

اس لہجے میں زینب کا شدتِ غم بھی عیاں ہے۔ بھائی کے مرنے کے بعد اپنے جینے کی اُمنگ انتہائی مایوسی میں بدل رہی ہے، نانا رسولؐ خدا، بابا علیؑ مرتضیٰ، اور ماں فاطمہؑ زہرا وہ ہستیاں ہیں جو دنیا سے پردہ فرما چکی ہیں اور بھائی کے مرنے پر اب زینب بھی موت کی طلبگار بن کر ان سب سے ملنے کی مشتاق ہے۔ پھر یہیں زینب کا لہجہ شکوہ آمیز بھی ہو گیا ہے کہ بھائی نے اپنے بدلے اس کو قتل کیوں نہ ہونے دیا۔ یہی وہ مرحلہ ہے کہ اب چھوٹی بہن بھائی

سے اظہار ناراضگی کے طور پر منانے کا تقاضا بھی کرتی نظر آ رہی ہے۔مگر زینب یہ بھی جانتی ہے کہ بھائی کے قتل کے بعد غمزدہ بیبیوں اور بچوں کو سہارے کی ضرورت ہے لہذا زینب بھائی کی لاش سے اٹھتے ہی ان بے کس عورتوں اور یتیم بچوں کی حفاظت کے لیے اپنے لہجے کو چٹانوں جیسا سخت اور مضبوط کر لیتی ہے۔ چنانچہ جب شمر چادریں چھیننے کے لیے آگے بڑھتا ہے تو زینب اسے للکار کر پیش قدمی سے روک دیتی ہے۔اس موقعے پر انیس نے زینب کی قوت ارادی اور اعصاب شکن حالات میں استقامت کو ان کے لہجے کی سختی سے یوں عیاں کیا ہے:

زینب نے کہا شمر! نہ ہاتھ اس کو لگانا
ہے میری ردا چادر زہرا کے برابر (۳۱)

انیس کے سلاموں میں خاص طور پر جو نسائی لہجہ محسوس کیا جاسکتا ہے وہ امام حسینؑ کی گیارہ سالہ دختر حضرت فاطمہ صغرا کا ہے۔جن کو بوجوہ علالت، امام حسینؑ اپنے ہمراہ لے کے نہیں گئے تھے، اور آپ مدینے ہی میں حضرت ام سلمٰی (زوجہ رسولؐ، جو امام حسینؑ کی نانی بھی تھیں) کے سپرد کیا تھا۔ یہ بچی اپنے باپ سے بے پناہ محبت کرتی تھی۔ حضرت فاطمہ صغرا کے جذبات کی ترجمانی انیس نے جس طرح اپنے سلاموں میں کی ہے اس سے اس بچی کے دل کی کیفیت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ایک مریض بیٹی جو روزانہ گھر کے دروازے کی چوکھٹ پر آ بیٹھتی ہے اور اپنے ماں باپ اور بھائی بہنوں کا انتظار کرتی رہتی ہے اور پھر شب کو تھک ہار کے حضرت ام سلمٰی سے اپنے دل کا حال یوں کہتی ہے:

شب آتی جب تو یہ نانی سے کہتی تھیں صغرا
کہ دم الجھنے لگا، وقتِ اضطراب آیا
نہ موت آتی ہے مجھ کو نہ نیند آتی ہے
اجل کو آئی اجل، خواب کو بھی خواب آیا (۳۲)

اب یہاں انیس نانی کی زبانی اس مضطرب و بیمار بچی کو تسلی و ڈھارس دیتے نظر آتے ہیں:

وہ کہتی تھیں کہ میں قربان جاؤں لیٹ رہو
یہ کیا غضب ہے شب آئی اک عذاب آیا
جو زیست ہے تو خدا کاٹ دے گا مدت ہجر
سنو گی اب کہ جگر بندِ ترابؑ آیا (۳۳)

اس شفقت آمیز لہجے میں اُمید کے ساتھ ساتھ حوصلہ افزائی کا تاثر بھی محسوس ہوتا ہے۔ یہ انسانی نفسیات کا مشاہدہ ہے کہ بعض اوقات بچوں کو ماں باپ سے کہیں زیادہ گھر کے بزرگوں خاص طور پر نانیوں اور دادیوں کے قصے، کہانیوں اور حکایتوں کے ذریعے اپنے بہت سے پر تجسس سوالات کا جواب مل جاتا ہے۔ انیس نے یہاں حضرت ام سلمٰی کے لہجے کو وہی سکون و اطمینان کی کیفیت کا حامل دکھایا ہے جو عموماً بچوں کو تسلی دیتے وقت بزرگ خواتین کا ہوتا ہے۔اس میں صغرا کی بے چینی اور موت کے ذکر پر حضرت ام سلمٰی کا ''میں قربان جاؤں'' کہنا اس

فطری محبت کو بھی ظاہر کر رہا ہے جو آپ کو اولادِ رسولؐ سے بے پناہ حد تک تھی۔ انیس کے مراثی کی طرح ان کے سلاموں میں بھی ہندوستانی رسم و رواج اور زبان و بیان کے اثرات غالب ہیں جس کے تناظر میں وہ ان نسائی لہجوں کو بھی ہندوستان میں مروجہ روزمرہ اور محاورات سے وابستہ تاثرات سے منسلک رکھتے ہیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہندوستان میں بزرگ خواتین اکثر اوقات چھوٹے بچوں کی معصوم اداؤں پر قربان جانے جیسے الفاظ کہا کرتی ہیں۔

حضرت فاطمہ صغرا ہی کے حال میں انیس نے امام حسینؓ کی اس بیٹی کا وہ لہجہ بھی دکھایا ہے جو ایک طویل مدت سے باپ کی آمد کی منتظر ہے اپنے بابا کو ایک خط لکھتی ہے۔ یہ خط کیا ہے ایک عرضی ہے جس میں ان تمام حفظ مراتب کو ملحوظ رکھا گیا ہے جو ایک باپ اور بیٹی کے باحرمت رشتے کے آداب میں شامل ہیں۔ مزید یہ کہ اس خط میں صغرا جب اپنے بابا سے مخاطب ہے تو اس کے علم میں ہے کہ اس کے والد نواسۂ رسولؐ بھی ہیں اور امام وقت بھی لہٰذا بیٹی کے لہجے میں وہ شدت احساس بھی در آیا ہے جو ایک حاجت مند کے ہاں اپنے حاجت روا کے سامنے یوں ظاہر ہوتا ہے:

شہ کو صغرا نے یہ عرضی میں لکھا
رحم کیجیے، طالب دیدار ہوں
شام سے گنتی ہوں تارے، تا سحر
صورت مہتاب شب بیدار ہوں
شربت دیدار ہے میری دوا
اے مسیحائے زماں، بیمار ہوں (۳۴)

صغرا اپنی اس عرضی کو قاصد کے ہاتھ روانہ تو کر دیتی ہے مگر باپ کی جدائی میں دل مضطرب کو سکون نہیں ملتا بلکہ اب خط کے جواب کا انتظار صغرا کو اور بھی بے قرار کیے دے رہا ہے اور یہاں باپ سے ایک محبت آمیز شکوہ بھی اس کے لہجے میں در آیا ہے:

فراق شاہ میں صغرا کو نیند کیا آتی؟
وہ شب تھی کون سی جو دل اضطراب نہ تھا
ہر اک سحر کو یہ کہتی تھی اٹھ کے نانی سے
مدینہ دور نہ تھا، بند خط کا باب نہ تھا
بھلا پیام زبانی تو بھیجتے بابا
اگر مریض کا خط قابل جواب نہ تھا (۳۵)

بلاشبہ انسان جس ہستی سے شدید ترین محبت کرتا ہے تو پھر شکوہ بھی اسی سے کرتا نظر آتا ہے اور پھر بات اگر چاہنے والے باپ کی فرقت میں چھوٹی سی بیمار بیٹی کی ہو جو مہینوں تک باپ کی آمد کے لیے بے چین رہی ہو، ایسے میں وہ قاصد کے ہاتھ اپنے بابا کو خط بھیجتی ہے مگر قاصد ایسے وقت میں وارد کربلا ہوتا ہے جب اعزا و انصار کی

شہادت کے بعد حسینؑ خود سفر شہادت پر روانہ ہونے کو ہیں، ایسے میں حسینؑ قاصد کے ہاتھ تحریری خط کیوں کر بھیج سکتے ہیں ،تاہم صغرا ان تمام باتوں سے بے خبر ہے ۔اس کے معصوم دل میں اب باپ کے لیے یہ محبت بھرا گلہ ہے کہ بابا کو اگر میرا خط پسند نہیں آیا تو کم از کم زبانی ہی مجھے کچھ کہلوا دیتے تا کہ میرے دل کو قرار آ جاتا۔ یہ بچی ماں باپ اور اپنے بہن بھائیوں کی جدائی میں ہر وقت اشک ریزی کرتی رہتی ۔ ایسے وقت میں نانی اُم سلمٰی کے ساتھ ساتھ دیگر رشتہ دار و ہم سایہ خواتین بھی اس کی دلجوئی کرتیں، رونے سے منع کرتیں اور کبھی ساتھ کی لڑکیاں دل بہلانے کو کھیلنے کے لیے کہتیں تو صغرا یوں جواب دیتی :

کہتی تھی صغرا کھیلنے کہتیں جو لڑکیاں
بابا کی یاد نے مجھے سب کچھ بھلا دیا
واللہ جیتے جی نہیں ہونے کی میں جدا
گر، اب کی حق نے مجھ کو پدر سے ملا دیا (۳۶)

صغرا کے لہجے میں میں یہاں اس عزم اور حوصلے کو با آسانی محسوس کیا جاسکتا ہے جو باپ کے آنے کی اُمید پر اس کے دل مضطرب کو مل گیا ہے ۔ ایک طرف وہ کھیل میں دلچسپی نہ لینے کا اظہار کر رہی ہے تو دوسری طرف جوشِ جذبات میں خدا کی قسم کھاتے ہوئے باپ سے ملنے کے بعد جدا نہ ہونے کا تصور اس کے لہجے میں چھپے اس یقین کو ظاہر کر رہا ہے جو اسے اللہ تعالیٰ اور اس کی کارسازیوں پر ہے ۔ وہ پُر امید ہے کہ ایک دن اس کے بابا مدینے ضرور واپس آئیں گے اور اس کا گھر پہلے کی طرح آباد ہوجائے گا ۔ بابا کی آمد سے گھر کی رونقیں بحال ہونے کی تمنا صغرا کے لہجے میں حسرت بن کر یوں ابھر رہی ہے:

کہتی تھی فاطمہ صغرا، اگر آئیں بابا
کیسا اجڑا ہوا آباد یہ گھر ہو جائے (۳۷)

اور پھر جب صغرا کو اپنے بابا کی شہادت کی خبر ملتی ہے تو اس وقت اس بچی کے جذبات کی جو تصویر کشی انیس نے کی ہے اس سے گویا حقیقی منظر سامنے آجاتا ہے:

اور ایک ایک سے کہتی تھی ، بتاؤ لوگو!
کہہ گئے ہیں مجھے مرتے ہوئے بابا کیا کیا (۳۸)

یہ فطرت انسانی ہے کہ جب اولاد کو باپ کے مرنے کی خبر ملے خاص طور پر وہ اولاد جو میلوں دور کی مسافت پر ہو اور کافی عرصے سے باپ سے ملی بھی نہ ہو، ایسے میں باپ کی موت سانحہ عظیم بن جاتی ہے پھر قتل حسین تو وہ مصیبت ہے جس پر ہر درد مند دل اشک بار ہو جاتا ہے۔ انیس ایسے میں صغرا کے دل کی کیفیت اس کے لہجے سے یوں ظاہر کر رہے ہیں کہ یہ بچی جو اپنے باپ کی فرقت میں مضطرب و بے قرار تھی، باپ سے ملنے کی خواہاں تھی، اپنے بابا سے بات کرنے کی آرزو مند تھی۔ اب اپنے باپ کی شہادت کے بعد ہر فرد سے جو واقعۂ کربلا کے وقت یہاں موجود تھا، ان سب سے صغرا یہ پوچھ رہی ہے کہ کیا بابا نے آخری لمحے مجھے یاد کیا؟ کیا میرے لیے کوئی پیغام

دیا۔ ظاہر ہے کہ وہ اولاد جو باپ کے مرتے وقت اس کے پاس موجود نہ ہو اسے سب سے زیادہ باپ کی قربت کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ یہ کم سن بچی بھی لہجے میں درد و غم کے ساتھ ساتھ ایک طرح کا تجسس لیے اپنے بابا کے آخری لمحات میں اپنا نام سننے کے لیے بھی بے چین ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ کوئی اسے بتا دے کہ اس کے بابا نے وقت آخر اسے کوئی پیغام دیا ہے یا نہیں۔ انیس نے اپنے سلاموں میں متعدد مقامات پر حضرت فاطمہ صغرا کے لہجوں کے اتار چڑھاؤ سے یہ ظاہر کیا ہے کہ ایک کم سن بیٹی کے جذبات ایک شفیق باپ کی جدائی میں مختلف کیفیتوں کا امتزاج بن کے ابھرتے ہیں۔

انیس نے اپنے سلاموں میں امام حسینؑ کی ایک اور بیٹی کے مصائب کو بھی بیان کیا ہے۔ یہ چار سالہ بچی سکینہ بنت الحسینؑ ہے جس نے واقعہ کربلا کے بعد طرح طرح کی صعوبتیں برداشت کیں۔ اسیر ہو کے کوفہ و شام کے زندانوں میں بھی رہی مگر باپ کی یاد میں بے چین و بے کل یہ بچی ہر لمحہ اپنے بابا کی صورت کی مشتاق تھی۔ انیس نے سکینہ کے لہجے میں باپ کے لیے وہی جذبات نمایاں کیے ہیں جو چار سال کی بچی کے باپ کی جدائی اور مصائب کی اذیتیں سہنے کے بعد ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ اس بچی کو بس باپ کی صورت درکار ہے اور وہ باپ سے اپنے دل کا حال بیان کرنے کے ساتھ ساتھ یہ التجا بھی کرتی ہے:

زندان میں کہتی تھی یہ سکینہ کہ تم بغیر
کٹتا ہے دن قلق میں تو شب اضطراب میں
ظاہر میں تم گر آ نہیں سکتے تو بابا جان!
بیٹی کو آ کے شکل دکھا جاؤ خواب میں (۳۹)

انیس کے سلاموں میں ایک اور نمایاں نسائی لہجہ ایک شب کی بیاہی دلھن فاطمہ کبریٰ کا ہے۔ اگرچہ کہ عقد قاسم و فاطمہ کبریٰ کی روایت ضعیف ہے اور مستند تاریخوں سے ثابت بھی نہیں مگر انیس کے زمانے میں اودھ میں امام حسنؑ کے بیٹے قاسم اور امام حسینؑ کی بیٹی فاطمہ کبریٰ کی شادی کی روایت پڑھنے کا عام رواج تھا۔ چنانچہ انیس نے بھی مراثی اور سلاموں میں اس روایت کو بیان کیا ہے۔ انھوں نے فاطمہ کبریٰ کے لہجے میں وہ شرم و حیا اور جذبات دکھائے ہیں جو نو بیاہتا دلہن کا خاصہ ہوا کرتے ہیں۔ فاطمہ کبری دلھن ہے جانتی ہے کہ شادی کے محض اگلے دن ہی اس کے شوہر کو قتل کر دیا جائے گا لہٰذا شادی کا عروسی ملبوس پہننے سے گریزاں ہے:

کہا کبری نے کہ ہو جاؤں گی بیوہ آخر
لوگو! پہناؤ نہ پوشاک شہانی مجھ کو (۴۰)

بالآخر فاطمہ کبریٰ کا دولھا روز عاشور شہید کر دیا جاتا ہے۔ اب اس موقع پر ایک رات کی دلھن کی کیا کیفیت ہو سکتی ہے، اس کے دل میں کیا درد چھپا ہو سکتا ہے یہ فاطمہ کبری کے لہجے سے عیاں ہے:

دلھن نے کہا رو کے صندل چھڑاؤ
بس اب خاک افشاں کی جا چاہیے

بڑھائے مری ناک سے نتھ کوئی
مجھے سرخ پوشاک کیا چاہیے (۴۱)

یہاں انیس نے دلھن کے جن لوازمات کا ذکر کیا ہے وہ عرب کی تہذیب اور رسم و رواج کے نہیں بلکہ ہندوستانی تہذیب وتمدن کی عکاسی کر رہے ہیں۔ مانگ میں صندل افشاں بھرنا، نتھ، سرخ لباس یہ سب عرب میں نہیں بلکہ ہندوستان کے رسم و رواج کے مطابق شادی کے موقع پر دلھن کو پہنایا جاتا تھا۴۲۔ یہاں یہ نکتہ قابل ذکر ہے کہ انیس چونکہ اپنے زمانے کے معراج سے بخوبی آشنا تھے اسی لیے روح عصر کو نظر انداز کر کے کوئی قدم آگے بڑھانا نہیں چاہتے تھے۴۳۔ یہی وجہ ہے کہ وہ واقعات کربلا کی منظر کشی کرتے وقت ہندوستانی تہذیب وتمدن کو پیش نظر رکھتے ہیں تا کہ کربلا کے واقعات کا ادراک و احساس کرنے میں زمان و مکان کے فاصلے حائل نہ ہوں اور ہر فرد معاشرہ کربلا کے کرداروں کو اپنے ہی ماحول اور تہذیب میں جیتا جاگتا اور متحرک محسوس کرے۔

انیس کے سلاموں کا ایک اور نسائی لہجہ خاندان آل رسولؐ کی کنیز فضہ کی بلند ہمتی اور عشق خاندان رسالتؐ کی غمازی کرتا نظر آتا ہے۔ فضہ حضرت فاطمہؑ زہرا کی کنیز خاص تھیں مگر گھر میں ان کا مرتبہ اتنا بلند تھا کہ علیؑ و فاطمہؑ کے بچے انہیں ''اماں فضہ'' کہہ کر مخاطب کرتے۔ فضہ نے بھی کنیز کا حق ادا کرتے ہوئے ہمیشہ خاندان نبوت کی خدمت کو اپنا شرف سمجھا۔ واقعہ کربلا میں یہ بھی موجود تھیں اور امام حسینؑ کی شہادت کے بعد جب فوج اشقیا نے اہل بیت کے خیموں کو لوٹنا چاہا تو فضہ نے انھیں روکنے کی کوشش کی:

کہتی تھی فضہ کسے لوٹو گے آ کر ظالمو!
سیم و زر شبیر کے اہل حرم رکھتے نہیں
فقر و فاقہ میں ہمیشہ ہوگئی سب کی بسر
ان رداؤں کے سوا کچھ اور ہم رکھتے نہیں
یہ مکاں محبوب حق کا ہے ، نہ آنا اس طرف
بے اجازت یاں ملائک بھی قدم رکھتے نہیں

فضہ کا یہ خطاب ان کی خاندان رسالت سے آگہی اور وابستگی کا کھلا ثبوت ہے۔ میر انیس نے ان کے لہجے میں پہاڑوں جیسی استقامت ظاہر کی ہے یقیناً یہ مضبوطی محمدؐ و آل محمدؐ سے متمسک رہنے کے باوصف ہی فضہ کے لہجے میں سمٹ آئی ہے۔

میر انیس کے سلاموں میں یہ نسائی جذبات اور ان کے اظہار کے لیے جو لہجے اختیار کیے گئے ہیں وہ اس حقیقت کی واضح دلیل ہیں کہ انیس پورے عالم اسلام کو یہ دعوت فکر دے رہے ہیں کہ رسولؐ اور آل رسولؐ نے دین اسلام کے لیے جو قربانیاں پیش کیں ان میں مردوں کے ساتھ ساتھ مخدّرات عصمت بھی ان کے شانہ بشانہ کھڑی رہیں۔ خاص طور پر واقعہ کربلا میں اہل بیت کی خواتین نے اپنے مردوں کی شہادت کے بعد جو مصائب برداشت کیے اس کی نظیر ملنی مشکل ہے۔ یہ خواتین اعصاب شکن حالات میں بھی ثابت قدم رہیں۔ اپنے

پیاروں کے مرنے پر آنسو تو بہائے جو کہ انسانی فطرت اور دل میں موجود جذبہ رحم کا تقاضا بھی ہے مگر خدا کی رضا میں راضی رہتے ہوئے کوئی شکوہ زیرِ لب بھی نہیں آیا۔ کٹھن حالات میں ثابت قدمی اور استقامت کا مظاہرہ بلاشبہ کربلا میں خواتین کے کرداروں سے اخذ کیا جاسکتا ہے۔ میر انیس کا کمال فن یہ ہے کہ انھوں نے اپنے سلاموں میں ان حوصلہ مند و دل شکستہ خواتین کے جذبات کی ترجمانی ہی نہیں کی بلکہ عوام الناس میں ان کرداروں کی عظمت کو روشناس کرانے کے لیے ان نسائی احساسات کو پرتاثیر لہجوں میں نمایاں بھی کیا ہے۔

حوالہ جات:

۱۔ الطاف حسین حالی، مولانا، **مقدمہ شعر وشاعری**، خزینہ علم وادب لاہور، ۲۰۰۱ء، صفحہ ۱۵۰

۲۔ شبلی نعمانی، علامہ، **موازنۂ انیس و دبیر**، اردو اکیڈمی سندھ کراچی، دسمبر ۱۹۶۲ء، صفحہ ۴۔۳

۳۔ علی جواد زیدی (مرتب)، **انیس کے سلام**، ترقی اردو بیورونئی دہلی، ۱۹۸۱ء، صفحہ ۱۷

۴۔ امداد امام اثر، **کاشف الحقائق**، جلد دوم، کارونیشن پریس لکھنؤ، بار اول، سن ندارد، صفحہ ۱۷۷

۵۔ اسد اریب، ڈاکٹر، **ارد و مرثیے کی سر گزشت**، کاروان ادب لاہور، بار اول، ۱۹۸۹ء، صفحہ ۱۶۲

۶۔ شمیم احمد، **اصناف سخن اور شعری ہیئتیں**، انڈیا بک امپوریم بھوپال، بار اول، ۱۹۸۱ء، صفحہ ۱۹۶

۷۔ ابوالخیر کشفی، ڈاکٹر، مضمون: سلام رضا کے دو باغوں کی سیر، مشمولہ مجلّہ **نعت رنگ**، کراچی، اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان خاص نمبر، شمارہ ۱۸، ۲۰۰۵ء، صفحہ ۲۶

۸۔ شارب ردولوی، ڈاکٹر، مضمون: انیس کے سلام، مشمولہ **انیس شناسی**، (مرتبہ) پروفیسر گوپی چند نارنگ، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۱۹۸۱ء، صفحہ ۳۸۶۔۳۸۵

۹۔ سید قمقام حسین جعفری، ڈاکٹر، **صنف سلام اور اس کا عہد بہ عہد ارتقا**، اکادمی بازیافت کراچی، بار اول، اپریل ۲۰۱۰ء، صفحہ ۴۰

۱۰۔ امداد امام اثر، **کاشف الحقائق**، صفحہ ۱۹۳

۱۱۔ علی جواد زیدی (مرتب)، **انیس کے سلام**، صفحہ ۳۹

۱۲۔ شبلی نعمانی، علامہ، **موازنۂ انیس و دبیر**، صفحہ ۷

۱۳۔ علی جواد زیدی (مرتب)، **انیس کے سلام**، صفحہ ۱۵۹

۱۴۔ ایضاً صفحہ ۱۵۲

۱۵۔ مجتبیٰ حسین، پروفیسر، مضمون: انیس نطق عظیم، مشمولہ سہ ماہی **رثائی ادب**، کراچی، دوصد سالہ یادگار انیس نمبر، شمارہ ۲۸۔۲۷، دسمبر ۲۰۰۲ء، صفحہ ۳۱

۱۶۔ علی جواد زیدی (مرتب)، انیس کے سلام، صفحہ۲۲۱
۱۷۔ ایضاً صفحہ۱۸۱ ۱۸۔ ایضاً صفحہ۱۷۱
۱۹۔ ایضاً صفحہ۱۷۸ ۲۰۔ ایضاً صفحہ۲۲۹
۲۱۔ ایضاً صفحہ۱۶۶ ۲۲۔ ایضاً صفحہ۱۳۷
۲۳۔ صالحہ عابد حسین، مضمون: کلام انیس اور اخلاقی قدریں، مشمولہ انیس شناسی، (مرتبہ) پروفیسر گوپی چند نارنگ، صفحہ۵۲
۲۴۔ علی جواد زیدی (مرتب)، انیس کے سلام، صفحہ۱۳۷
۲۵۔ ایضاً صفحہ۱۵۳ ۲۶۔ ایضاً صفحہ۱۸۰
۲۷۔ ایضاً صفحہ۹۷ ۲۸۔ ایضاً صفحہ۲۰۷
۲۹۔ ایضاً صفحہ۲۵۹ ۳۰۔ ایضاً صفحہ۲۰۸
۳۱۔ ایضاً صفحہ۱۹۴ ۳۲۔ ایضاً صفحہ۸۹
۳۳۔ ایضاً صفحہ۸۹ ۳۴۔ ایضاً صفحہ۹۹۔۹۸
۳۵۔ ایضاً صفحہ۸۵ ۳۶۔ ایضاً صفحہ۱۷۲
۳۷۔ ایضاً صفحہ۲۶۳ ۳۸۔ ایضاً صفحہ۱۶۶
۳۹۔ ایضاً صفحہ۲۰۱ ۴۰۔ ایضاً صفحہ۲۰۹
۴۱۔ ایضاً صفحہ۱۴۲
۴۲۔ اعجاز حسین، ڈاکٹر، اردو شاعری کا سماجی پس منظر، کارواں پبلشرز الہ آباد، ۱۹۶۸ء، صفحہ۳۴
۴۳۔ سید عبد الباری، ڈاکٹر، لکھنؤ کے شعر و ادب کا معاشرتی و ثقافتی پس منظر، نشاط آفسٹ پریس فیض آباد، مئی ۱۹۷۷ء، صفحہ۴۰۴
۴۴۔ علی جواد زیدی (مرتب)، انیس کے سلام، صفحہ۹۸۔۹۷